⊙ عاصمہ کبیر

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تانیثی مطالعہ

Abstract:

In Urdu, early period of feminism was about reformism in which men also participated along with the women. Sir Syed Ahmed Khan, Allama Rashid Al-Khairi and Deputy Nazir Ahmed made women's issues the subject of their writings. Later, the modern educated generation of Ali Garh University strengthened and reinforced this movement. The first loud and strong voice for women rights of Rasheed Jahan emerged from the platform of Progressive Movement. Women from subcontinent also worked hard on raising awareness in all the women for their rights and problems. The writings of Muhamadi Begum, Mughri, Hamayun, Akbari Begum, Anjuman Aara, and Nazar Sajjad Haider are some notable mentions who worked on this cause. Nazar Sajjad is one of the first women storytelling writers of Urdu language. She penned down several fictions, essays, and novels for women reforms. Her writings created a new thought and new sense of awareness among women, but her feminist thinking was slightly different from western feminism, she adapted to the social needs of Indian society and took a new form.

Keywords:

Novel Fiction Nazar Sajjad Feminism Feminist Women

تانیثیت جس کے لیے انگریزی میں فیمینزم (Feminism) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، عربی لفظ تانیث کا اسم کیفیت ہے۔ جس کے لغوی معنی مونث کے ہیں۔ لغوی معنی اور مفہوم سے ہٹ کر اصلاحی لحاظ سے دیکھا جائے تو تانیثیت

سے مراد خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا، اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا بطور انسان اپنے حقوق کو منوانا تانیثیت ہے۔ بقول انیس ہارون:

''خواتین پر ظلم وزیادتی کے خلاف آواز اٹھانا ان کے حقوق کی بات کرنا فیمینزم ہے۔''(۱)

تانیثیت عورتوں کی اس ذہنی بے داری کا نام ہے جس کی تفہیم نے اسے احساس دلایا کہ وہ ایک شے یا مال نہیں جسے تحفے، تحائف میں دیا جائے۔ قبیلوں کی لڑائیوں میں بطور تاوان پیش کیا جائے یا جائیداد کی طرح وراثت میں منتقل کیا جائے۔ بل کہ وہ ایک مکمل انسانی وجود ہے جو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، نفسیاتی غرض ہر سطح پر کچھ حقوق واوصاف کی مالک ہے۔ جنھیں روندا یا کچلا نہیں جاسکتا۔ عورت کی اسی بے داری شعور کا نام تانیثیت ہے۔ اس تانیثی رویے نے عورت کو جو شعور دان کیا اس نے عورت کو سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیوں اس کی ذات ہر جگہ مرد کے حوالے سے پہچانی گئی۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی، داشتہ، ویشیا، رنڈی، رکھیل، ہر رشتہ مرد کے ساتھ تعلق کا غماز ہے۔ مرد ہی تقدس عطا کر رہا ہے اور مرد ہی حقیر القابات سے نواز رہا ہے۔ اسی حقیقت کے ضمن میں میری ایبنے فرگوسن نے کہا ہے:

''مرد کو تو پوری دنیا، فطرت، سماج حتیٰ کہ خدا کے ساتھ رشتے کی رو سے پیش کیا گیا، مگر عورت کا تصور مرد کے ساتھ تعلق کی رو سے کیا گیا ہے۔''(۲)

عورت کے ساتھ استحصالی سلوک اور بوڑھے وفرسودہ ذہنی رویے پدرشاہی نظام کی دین تھے۔

''پدرشاہی نظام مرد کی بالا دستی کو کہتے ہیں جس کی بنیاد سماج، خاندان، سیاست، معیشت اور مذہب پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ اس پورے نظام کی تاریخ ہے جس کی جڑیں مختلف سماجوں مروجہ رسوم وروایات اور مختلف ادوار تک پھیلی ہوئی ہے۔ سترھویں صدی کے زمینی حقائق کچھ اور تھے۔ اس کے بعد آنے والی صدیوں کے مختلف اور اکیسویں صدی کے اپنے خیالات ہیں جس نے عورتوں کی جدوجہد کو مختلف سانچوں میں ڈھالا ہے۔''(۳)

مرد مرکز معاشرہ ہمیشہ سے قائم نہ تھا۔ بلکہ ہزار ہا برس پہلے مادری نظام رائج تھا۔ جس میں عورت ہر نظام کی حاکم تھی لیکن ذرائع پیداوار سے الگ ہونے پر عورت اپنے مقام ومرتبے سے گرنا شروع ہوگئی۔ اب عورت نے دیوی سے داسی کا سفر شروع کیا۔ صدیوں کی پامالی کے بعد اپنے حقوق کے ادراک پر اٹھارویں صدی میں مغربی معاشرے سے فیمینزم کے نظریے نے جنم لیا۔ میری ولسٹن کرفٹ کے مضمون Vindication of the Rights of Woman کو اسی سلسلے کا پہلا اظہار یہ کہا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک کے اثرات مشرق میں بھی نمودار ہونا شروع ہوئے۔ مشرق کی عورت بھی اپنے جائز حقوق سے محروم، اپنی شناخت کے لیے مرد کے مرہون منت تھی۔ برصغیر کے سماج میں اس کی حیثیت باندی کی سی تھی یا وہ جنسی کھلونا تھی۔ ثاقب رزمی آزادی نسواں کا نیا سویرا میں لکھتے ہیں:

''یہ کتنی اندوگیں روش ہے کہ اعورتوں کو برائے تسکین حظ جنسی گھروں میں پودوں کی، چار پایوں کی طرح قید وبند رکھا ہے اور ان کو انسانیت کے ارفع مقام سے بھی گرا دیا ہے۔ وہ عورتیں جو اٹھیں تو مردوں کو مات دیں جو قابلیت کے جوہر دکھائیں ان کی سلطنت چلائیں۔''(۴)

مغرب میں اپنے حقوق کی پاسداری کے لیے اٹھائی گئی انقلابی آواز جب برصغیر پہنچی تو یہاں بھی عورت کے مروجہ کردار و مقام کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ جب عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی تو ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے۔ انھیں مغرب زدگی کا طعنہ دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگی ہیں۔ حقوق نسواں کی تحریک میں حائل رکاوٹوں کی نشان دہی کرتے ہوئے عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

''درحقیقت ہمارے سماج میں عورتوں پر تین طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ اوّل قانون، دوم رسم ورواج اور غربت وجاہلیت۔''(۵)

حقوق نسواں کی تحریک میں مردوں نے بھی حصہ لیا۔ حالی تو اس تحریک کے علم بردار کہلائے۔ اپنے ایک مضمون 'ہمارے معاشرے کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے' کے عنوان کے تحت تحریر کرتے ہیں:

''ہمارا معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک عورتوں کی تعلیم نہیں ہوگی۔ سماج سے غلط رسوم کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ وہ خود ان کو غلط نہ سمجھیں۔ ان کی اور دل چسپیاں نہ ہوں۔''(۶)

اصلاح پسندی کے اس ابتدائی دور میں سرسید اور اُن کے ہم نوا ڈپٹی نذیر احمد اور مصورِ غم علامہ راشد الخیری وغیرہ نے بھی عورت کے مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ حالی کی 'چپ کی داد'، 'مناجاتِ بیوہ'، 'مجالس النساء'، راشد الخیری کی نوحہ زندگی، صبح زندگی، نذیر احمد کی مراۃ العروس، بنات النعش، ایامیٰ، غرض اس دور کا تمام ادب جابجا عورتوں پر ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاجی رنگ لیے ہوئے ہے۔ آگے چل کر علی گڑھ کی تعلیم یافتہ نسل نے بھی اپنے انداز میں تحریک نسواں کو تقویت دی۔ یلدرم کی تحریریں اور شیخ عبداللہ کا رسالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ تاہم حقوق نسواں کے حوالے سے پہلی بلند آہنگ آواز رشید جہاں کی صورت میں ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم سے ابھری جن کا افسانہ 'دلی کی سیر' افسانوی مجموعہ انگارے میں شامل تھا۔ خواتین کے مسائل پر پہلی بار قلم اٹھانے والی خواتین ہی تھیں۔ لاہور سے محمدی بیگم کے جاری کردہ تہذیبِ نسواں (۱۸۹۸ء)، علی گڑھ سے شیخ عبداللہ و بیگم عبداللہ کا ماہنامہ خاتون (۱۹۰۶ء) کا مقصد خواتین کے شعور کو بے دار کرنا ہی تھا۔ راشد الخیری کا عصمت (۱۹۰۸) بھی انھی مقاصد کا حامل تھا۔ محمدی بیگم، صغرا ہمایوں، اکبری بیگم، حسن بیگم، آصف جہاں، انجمن آراء اور نذر سجاد حیدر کی افسانوی تحریریں اسی سلسلے میں کی جانے والی نمایاں کوششیں تھیں۔

نذر سجاد حیدر کا شمار اردو کی اولین قصہ گو خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے بنت نذر باقر کے نام سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ نذر سجاد حیدر اردو کے پہلے افسانہ نگار یلدرم کی زوجہ اور اردو ادب کی مایہ ناز ناول نگار قرۃ العین کی والدہ تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں میر نذر الباقر کے ہاں پیدا ہوئیں جن کا نام مسرت تنویر رکھا گیا۔ میر نذر باقر کا گھرانہ روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ شدید روایتی پردے کے بھی مخالف تھا۔ میر باقر نے اپنی بیٹی نذر زہرا اور ان کی چھوٹی بہن ثروت کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک یورپین میم ملازم رکھی۔ وہ اپنی بڑی بیٹی نذر زہرا کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر وہ اردو کی ایک قابل فخر ادیب بن کر سامنے آئیں۔ انھوں نے افسانے مضامین اور ناول لکھے جو زمانے کے مشہور رسائل تہذیب نسواں،

خاتون اور عصمت میں شائع ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی ممتاز علی کے جاری کردہ ہفتہ وار اخبار پھول کی ایڈیٹر بھی رہیں جو دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ نذر سجاد نے بچوں کے لیے 'سلیم کی کہانی'، 'پھولوں کا ہار'، 'سچی رضیہ اور اس کی بکری' جیسی کہانیاں لکھیں جنھیں پنجاب ٹیکسٹ بک کمپنی نے اردو نصاب کا حصہ بنالیا۔

اختر النساء بیگم نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۱۰ء میں چودہ سال کی عمر میں لکھا۔ نذر سجاد نے دس ناول اور دو سوانح لکھے جن میں سے اختر النساء بیگم کے علاوہ آہ مظلوماں (۱۹۱۴ء)، جاں باز (۱۹۳۵ء)، نجمہ (۱۹۳۹ء) اور حرماں نصیب (۱۹۳۸ء) زیادہ مقبول ہوئے۔ مولانا رزاق الخیری نذر سجاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ بحث چھڑے کہ خود عورتوں میں کس نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور ان کے شرعی حقوق کے حصول کی انتھک کوششیں کیں، عظیم المرتبت، بلند پایہ لکھنے والیوں میں اردو کی کون سی مصنفہ ہے جس کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کیا جائے مشرقی شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو تو ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جائے گا۔''(۷)

نذر سجاد نے جب لکھنا شروع کیا تو یہ بیسویں صدی کے اوائل کا دور تھا۔ جس میں ہندوستان سیاسی و سماجی ہر دو سطوں پر بڑی تبدیلیوں کی زد میں آ چکا تھا۔ پرانی اقدار تیزی سے بدل رہی تھی لیکن عوام کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس وقت ہندوستان مسائل کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ عورتوں کی حالت خاص طور پر خراب تھی۔ معاشرے کے بے جا رسم و رواج کی قید نے عورت پر بہت ظلم ڈھایا تھا۔ تعلیم کے فقدان نے جاہلانہ ریت و رواج کو تقویت بخشی جس کی وجہ سے معاشرہ مسلسل انحطاط کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں لوگ اصلاح کے لیے آئے۔ خواتین نے اپنے طبقے کی اصلاح کے لیے آواز اٹھائی۔ انھی خواتین میں نذر سجاد حیدر کا نام اہم ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعے عورت کو معاشرے کا اہم جزو قرار دیتے ہوئے اسے اس کی صلاحیتوں سے آگاہ کروایا بل کہ غازی پور میں اسلامیہ گرلز سکول قائم کر کے لوگوں کو تعلیم نسواں کے لیے قائل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ نتیجتاً انھیں شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نذر سجاد اور چند دوسری خواتین نے آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس کامیاب رہی لیکن ایک اخبار نے تنقید کرتے ہوئے لکھا:

> ''جب سے یہ تحریک شروع کی گئی ہے بہت سی گوشہ نشین خواتین میں ایک جوش سا پیدا ہو گیا ہے۔ خدا نہ کرے۔ بنت نذر باقر اور ان کی ہم خیال لڑکیوں اور بیگمات کو اس میں کامیابی ہو یہ بے جا آزادی کا پیش خیمہ ہے۔''(۸)

نذر سجاد حیدر نے ان تمام مخالفتوں اور تعصّبات کی فکر نہ کرتے ہوئے حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ نذر سجاد کی مساعی جمیلہ کا مقصد خواتین کو اپنے صلاحیتوں کی پہچان کروا کر بہ وقتِ ضرورت ان کو بروئے کار لانے کا جذبہ اجاگر کرنا تھا۔ اس کے حصول کے لیے انھوں نے ایسے کردار تخلیق کیے جو تعلیم یافتہ، باہمت، خود

اعتماد، اور آزاد خیال ہیں۔ جو اپنا راستہ خود اپنی جود جہد سے متعین کرتے ہیں۔ اختر النساء بیگم کی تخلیق بھی مصنفہ کی اسی سوچ کی عکاس ہے۔

نذر سجاد کی تحریروں کے موضوعات عورت کی مظلومیت، بے چارگی، پردے کی بے جا پابندی، تعلیم کی کمی، دوسری شادی، عورت کے عورت پر مظالم، بے جا آزادی ورمغرب کی اندھی تقلید کے خلاف ہیں۔ اختر النساء بیگم بھی انھی موضوعات پر مشتمل ایک ایسا ناول ہے جو انھوں نے انتہائی کم عمری میں تہذیب نسواں کے لیے لکھا۔

اختر النساء بیگم:

اختر النساء بیگم انیسویں صدی کے روایت پرست معاشرت میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی دردناک سرگزشت ہے جو اپنی روشن خیالی اور تعلیم کی بدولت مسائل پر قابو پالیتی ہے۔ نذر سجاد نے یہ ناول طبقہ اناث کی اصلاح وحمایت میں لکھا وہ خود لکھتی ہیں:

> ''اپنے قلم کج مج رقم سے ایک مضمون قصے کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیا جس میں بے سوچے سمجھے دوسری شادی کی خرابیاں، جاہل ماں کا سوتیلی اولاد سے برابر تاؤ، تعلیم یافتہ لڑکی کی کا بدمزاج جاہل سوتیلی ماں کی اطاعت کرنا اور دوسری شادی کے بعد باپ کا بیٹی کی طرف سے بے پروا ہو جانا اور جاہل بیوی کے کہنے سے ایک جاہل وذلیل گھر میں بیٹی کی شادی کر دینا اور سمجھ دار لڑکی کا صبر وتحمل کے ساتھ سب مصیبتیں برداشت کرنا اور بعد انتقال شوہر لاوارثی کی حالت میں کوشش اور محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے قومی خدمت میں عمر بیوگی بسر کرنا وغیرہ مضامین مذکورہ تھے۔''(۹)

اختر النساء بیگم کا پلاٹ دو گھرانوں کی کہانی پر مشتمل ہے۔ ایک گھرانہ رفیق احمد اور دوسرا مسز وقار کا ہے۔ رفیق احمد کی بیٹی اختر النساء آٹھ برس کی تھی کہ اس کی ماں جو کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت سلیقہ شعار خاتون تھیں، وفات پا گئیں۔ بیوی کی وفات کے بعد رفیق احمد (بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی) جو کہ نہایت آزاد خیال جنٹلمین تھے۔ لوگوں کے کہنے سننے میں آ کر دوسری شادی پر آمادہ ہو گئے۔ جانی بیگم ان کی دوسری بیگم تھی جو نہایت بدسلیقہ، پھوہڑ اور جاہل عورت تھی، جس نے آتے ہی نہ صرف پورے گھر کا نظام بگاڑ دیا بل کہ اختر بھی ان کے سوتیلے پن کا بری طرح شکار ہونے لگی۔ لیکن اپنی امن پسند طبیعت کے بدولت کبھی باپ سے شکایت نہ کی۔ بیوی کے چکر مکر میں آ کر رفیق احمد اپنی بیٹی سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً اختر جیسی سلیقہ شعار اور پڑھی لکھی لڑکی کی شادی، جانی بیگم اپنے مفاد کی خاطر ایک جاہل وذلیل گھرانے میں کرا دیتی ہے جہاں پہلے ہی سے کئی مسائل اور مصیبتیں اختر کی منتظر تھیں جنھیں اختر خاموشی سے برداشت کر گزرتی ہے۔ شوہر ظفر کی وفات کے بعد مسائل ودقتوں میں گھری اختر دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کرتی ہے اور انتھک محنت وکوشش کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے انسپکٹریس زنانہ مدارس کے عہدے پر فائز ہو کر اپنی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔

ناول میں اختر کی خالہ مسز وقار کے گھر کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ، با اخلاق اور شریف لوگوں پر مشتمل ایک گھرانہ ہے جس کی امن وآشتی، سکھ، چین لوگوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ یہ مسز وقار کی بہترین تربیت وپرورش کا نتیجہ ہے جو وہ ہر کام شریعت وتہذیب کے تقاضوں کے مطابق سرانجام دیتی ہیں۔

نذر سجاد کا یہ ناول ان کی روشن خیالی، جدت پسندی اور ہندستانی سماج پر ان کی وقت نظر کا بین ثبوت ہے۔ ناول میں مصنفہ نے تصویر کے دو رخ پیش کرتے ہوئے ایک طرف لاڈلی اور جانی بیگم کے کرداروں کی صورت میں ناخواندہ ہندوستانی عورت کی جہالت و کج رویوں کو سامنے لایا ہے جس کج خلقی، بدسلیقگی اور جہالت کے باعث کنبے کے کنبے بربادی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ناول میں جانی بیگم ایک ایسا ہی کردار ہے جو ہندوستانی نام نہاد پردے اور رسم و رواج کی ایسی اسیر ہے کہ مسز رفیق جیسے عالی خیال شخص کو اپنے دام جال میں ایسا پھانس لیتی ہے کہ وہ اب اکثر اوقات گلے اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لپیٹے رکھتے تھے۔ اسی پر بس نہیں تھا بل کہ پوری رفیق منزل جو مرحومہ مسز رفیق کی نفاست اور اعلیٰ ذوق کا نمونہ تھی ہندستانی رسم و رواج کا اکھاڑہ بنا ڈالتی ہے۔ کھانے کا کمرہ، خانساماں، باورچی خانہ، مالی، سب کچھ بدل دیتی ہے یہاں تک کہ ہندوستانی پردے کے پیش نظر باغیچے کے جنگلے کے گرد دقاتیں لگوا دیتی ہے۔

یہ ناول مصنفہ کے جدت پسند خیالات کا ترجمان ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ عورت کی مادر پدر آزادی کی حامی ہیں بل کہ انھیں پردہ کی بے جا پابندی کھلتی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ: ''ہندوستانی پردے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ شدت کا پردہ محض ہندوستان کی اختراع ہے۔''(۱۰)

دراصل نذر سجاد اس پردے کے خلاف تھیں جو عورت کو چار دیواری میں قید کر کے زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک ہونے میں حائل تھا جس کو بنیاد بنا کر ہندوستانی مسلم سماج نے عورت کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ ناول میں جانی بیگم نہ صرف اس روایتی پردے پر سختی سے کار بند ہے بل کہ ایک ان پڑھ و جاہل عورت کے روپ میں سوتیلی ماں کا ایک ایسا کردار بھی ہے جو اپنے جاہلانہ اور عدوات پر مبنی فیصلوں کی بدولت اختر کی زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہے۔ ناول میں اختر موقع بہ موقع اس کی عتاب کا نشانہ بنتی نظر آتی ہے۔ نذر سجاد نے اس ناول میں سوتیلی ماں کے ناروا سلوک کا عذاب سہنے والی اختر کی زندگی کو پیش کر کے ہندستانی مسلم سماج میں پنپنے والی دوسری شادی جیسی قبیح رسم کا خاتمہ کرنا چاہا۔ دوسری شادی اور سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں کا کرب سہنے والے بچوں کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے نذر سجاد لکھتی ہیں۔

> ''جاہل و ظالم سوتیلی ماں کے ہاتھوں ہزاروں بن ماں کے بے بس بچوں کی جانیں عذاب میں ہیں لڑکے پھر بھی تھوڑے عرصے بعد خود مختار ہو کر ان عذابوں سے نجات پا لیتے ہیں لیکن افسوس بے چاری لڑکیوں کی حالت پر جو بوجہ بے زبانی بے بسی و کم علمی کے عمر بھر کو برباد اور زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ اول تو سوتیلی ماں کے اختیار میں میکے میں ہی سخت محنت اٹھاتی ہیں۔ پھر ماں کی مہربانی سے دوسرا گھر بھی دوزخ سے کم نہیں ملتا۔''(۱۱)

ایسا ہی کچھ قصے کی ہیروئن اختر کے ساتھ ہوا۔ رفیق احمد بھی اختر کو سوتیلی ماں کو سونپ کر بیٹی کی ہر طرح کی ذمہ داری سے بے نیاز ہو گئے، اور بغیر تحقیق و چھان بین تعلیم یافتہ اختر کو ایک بے جوڑ شخص سے منسوب کر دیا گیا۔ اختر کو اس بات کا نہایت قلق تھا جس کا اظہار یوں کرتی ہے۔

> ''وہ کون لوگ ہیں کہاں کے ہیں؟ کیسے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہو گی۔ اس کی عادات۔ مزاج۔ اخلاق۔ تعلیم۔ عمر۔ خیالات۔ نام تک بھی تو مجھے معلم نہیں.....''(۱۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کو اس زبوں حالی کا شدت سے احساس تھا، کہ جہالت کی بنا پر عورت کی مرضی و رضا کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اختر کس طرح عورت کی بے بسی اور بے زبانی کو محسوس کرتی ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت بھی ہوتا ہے۔ جب مسز وقار اپنی بیٹیوں کو نسبت طے کرنے سے پہلے ان کی رائے لینا چاہتے ہیں۔ تب اختر سماج کے جھوٹے روایتی اصولوں کے خلاف اپنے خالہ اور خالو کے طرز عمل کو سراہتی ہے:

> ''یہ آپ کی زمانہ شناسی اور دور اندیشی اور اس بے بس و بے زبان فرقے کے حال پر کمال مہربانی ہے کہ اپنا ہر طرح کا اطمینان اور سوچ بچار اور پسند کر لینے پر بھی ان کم عمر، کم سمجھ بے چاریوں کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی تمام عمر کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ہے۔ میرے خالو جان آپ کی اس اعلیٰ ہم دردی اس سچی محبت کا جو اپنی لڑکیوں سے ہے بل کہ یوں کہوں کہ اس بے کس فرقے سے ہے تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔''(۱۳)

اختر النساء بیگم کا عورت کے لیے بے بس اور بے زبان طبقے جیسے الفاظ کا استعمال اس امر کا غماز ہے کہ اختر عورت کی مظلومیت کو محسوس کرتی تھی۔ نذر سجاد معاشرت کی کج رویوں کی محض نشان دہی پر اکتفا کرنے والوں میں سے نہ تھی۔ وہ ایک مصلح تھیں اپنی تحریروں کے ذریعے اصلاحی مشن لے کر چلیں تھیں جس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مسئلے کا حل بھی پیش کیا۔ اس مقصد کے لیے اپنی ناولوں میں تعلیم یافتہ گھرانوں کو تشکیل دیا۔ ناول اختر النساء بیگم میں مسز وقار کا گھرانہ ہے جس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں۔ حصول تعلیم اور زندگی بسر کرنے کے طور طریقے دونوں کے لیے یکساں ہیں حقوق و فرائض میں دونوں مساوی درجہ پر فائز ہیں۔ مسز وقار کے گھرانے کا ماحول پیش کر کے نذر سجاد حیدر معاشرت کے لیے تعلیم کی اہمیت واضح کرنا چاہتی ہیں کہ تعلیم انسان کی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ تعلیم ہی کے ثمرات تھے کہ مسز وقار اور ان کا گھرانہ لغو رسومات سے کوسوں دور تھا۔ ایک موقع پر بچپن کی منگنی کے خلاف مسز وقار اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

> ''چوں کہ ہم لوگ صغر سنی کی منگنی و شادی کے مخالف ہیں اس لیے کوئی رسم ان کی زندگی میں نہ کی گئی۔ خیال تھا جب دونوں تعلیم سے فارغ ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔''(۱۴)

انیسویں صدی کے مسلم معاشرے میں کئی قباحتوں نے رسوم کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ مثلاً بچپن کی منگنی بچپن کی شادی اور نکاح وغیرہ۔ نذر سجاد نے عقد ثانی، پردے کی بے جا پابندی کے ساتھ اس موضوع کو بھی اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہوئے کہا:

> ''زمانہ بدل گیا ہے لڑکیاں گائے بکریاں نہیں رہیں کہ جہاں چاہا باندھ دیا جائے۔ نذر سجاد شادی سے قبل منگنی کو اچھی چیز سمجھتی ہیں کہ اس رسم صورت میں لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ساتھ یہ تجویز بھی دی کہ نکاح سے بیشتر ان دنوں میں خط و کتابت بھی کروادی جائے۔''(۱۵)

اس ناول میں مسز وقار ایک ایسا کردار ہے جو حقوق نسواں کے لیے مسلسل متحرک و سرگرم عمل ہے جو اپنی تقریر اپنے عمل کے ذریعے ہر اس رواج کی جو عورت کو انسانیت کے مقام سے گرا کر باندی و کنیز کے درجہ تک لے جاتا ہے۔

پر زور مذمت کرتی ہیں۔ وہ ہر اس امر کو جو عورت کی زندگی کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ وہ ہندوستانی سماج میں پنپنے والی رسومات قبیحہ ہی کیوں نہ ہو جنھیں اس معاشرے میں اہم فریضہ سمجھ کر ادا کیا جاتا تھا۔ سخت چوٹ کرتی ہے اور ان تمام فضولیات سے چھٹکارے کا حل تعلیم نسواں کو گردانتی ہیں۔ نذر سجاد جہاں ایک طرف تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیتی ہیں وہیں وہ جانتی ہیں عورت کے بدلے ہوئے روپ کو سماج قبول نہیں کر پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے اختر کو سوتیلی ماں اور سسرال کے ہر دکھ اور وحشیانہ سلوک پر صبر قناعت کا مجسمہ بنا کر پیش کیا۔ ساس سسر اور شوہر کے مرنے پر چچا سسر ساس کی خدمت پر مامور کر دیا۔ یہاں تک کہ سلطانہ جیسی گنوار عورت کے قدموں میں گر کر گھر وچھت کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ نئی تعلیم کی بدولت اختر کسی بھی اسکول میں کام کر کے بافراغت زندگی بسر کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس قدر مصائب اپنے سر لیے ہوئے تھی۔ نذر سجاد زمانہ شناس عورت تھیں وہ جانتی تھیں مردانہ سماج تو درکنار جہالت کی اسیر خواتین بھی اختر کے اس اقدام کو قبول نہیں کر پائیں گی۔

> ''کہ دیکھو تعلیم کا اثر۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا اس کا کیا اچھا نتیجہ نکلا؟ ہندوستانی رانڈیں ایک کونے میں پڑ کر ساس سسر کی جوتیوں میں عمر بسر کر دیتی ہیں۔ یہ علامہ نوکری کرنے نکلی۔''(۱۶)

بیوہ کی زندگی ہندوستانی معاشرت کا کرب ناک پہلو ہے۔ جس میں فضولیات کا حصار اس کے وجود کے گرد کھینچ کر زندگی کا دائرہ اس پر تنگ کر دیا جاتا تھا۔ پوری زندگی سوگ کی حالت میں ثواب کی نیت سے بٹھا دی جاتی ہے۔ اس نے ہنسنے، بولنے، کھانے، پہننے، اوڑھنے کو حقارت و نفرت سے دیکھا جاتا۔ جس کا تذکرہ اختر بڑے دکھ کے پیرائے میں کچھ اس طرح کرتی ہے:

> ''آپ نہیں جانتے کہ ہندوستانی بیوائیں کس حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں۔''(۱۷)

بیوگی کے بعد اختر پھر سے اپنا سلسلہ تعلیم بحال کرتی ہے تو پردہ آڑے آجاتا ہے۔ ایسے مشکل وقت میں پردہ ترک کرتے ہوئے ان مسائل اور مجبوریوں کو بیاں کرتی ہے جو انیسویں صدی کے روایت پرست مسلم معاشرت میں تعلیم نسواں کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔

> ''ابا جان صرف اس غرض سے میں نے اپنا نام بدلا تھا کہ اختر النسا مشہور ہونے سے سب پہچان جائیں گے کہ میں ایک ہندستانی مسلمان لڑکی ہوں اور مجھے یہ بات اس لیے پسند نہ تھی کہ ایک مسلمان لڑکی کا آزادانہ طریق سے تعلیم پانا ہماری قوم کی نظروں میں کھٹکے گا اور معیوب سمجھ کر عوام کی نظریں مجھ پر پڑیں گی اور میں تماشا بن جاوں گی۔ لوگ ہزاروں باتیں بنائیں گے اور تو علیحدہ رہے قومی اخبارات ہی لعن طعن کر کے کچھ کا کچھ لکھیں گے اس خیال سے بجائے اختر کے ستارا نام ظاہر کیا کہ پارسی لڑکی سمجھ کر کسی کو حرف گیری کا موقع نہ ملے گا۔''(۱۸)

عورت کے حوالے سے مسلم سماج میں جہالت کا سلسلہ یہی پر نہیں تھمتا بل کہ تعلیم حاصل کر کے جب اختر اپنے بل بوتے پر کام کرنے لگتی ہے۔ تو مخالفین تعلیم نسواں کی طرف سے اٹھنے والے ممکنہ اعتراضات کے پیش نظر اپنے والد کو

ایک خط کے ذریعے آگاہ کر کے اپنی مجبوریوں سے بھی مطلع کر دیتی ہے۔

''ابا جان زمانہ بہت برا ہے خصوصاً ان اطراف تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کان پور اور میرٹھ کے بہت سے مخالفین تعلیم نسواں میری بابت آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہیں گے اور بیگم صاحبہ تو غضب ہی ڈھائیں گی جس کا مجھے از حد خیال ہے مگر میں مجبور ہوں کہ سوائے قومی خدمت کے میری بسر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔''(۱۹)

اختر کی خسیّت نوکری کرنے اور تنہا زندگی بسر کرنے پر مردانہ سماج کے ردعمل کا ادراک رکھتی ہے۔ لیکن وہ باحوصلہ اور مضبوط قوت ارادی کی مالک لڑکی ہے جو محض اس وجہ سے اپنی زندگی خراب نہیں کرتی بل کہ حالات سے مسلسل نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہے اور اپنی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کر کے لڑکیوں کے لیے مثال قائم کرتی ہے:

''اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ہو سکے۔ تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ تمام قوم سنبھل گئی۔''(۲۰)

نذر سجاد عورت ہونے کے ناطے اپنے طبقے کے زلوں حالی کا بخوبی احساس رکھتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں عورتوں کی اصلاح ہو تا کہ وہ اپنی زندگی مرضی سے جی سکیں اور اس لیے وہ تعلیم کا حصول از حد ضروری خیال کرتی ہیں۔

حرماں نصیب:

حرماں نصیب فیروزہ اور ظفر کی ناکام داستان عشق اور ایک بہن کی بھائی کے لیے لازوال محبت کی داستان ہے۔ جاپان کی رہنے والی فیروزہ اپنے دادا اور اپنے بھائی فیروز کے ساتھ گرمائی تعطیلات گزارنے کے لیے مسوری آتی ہے۔ یہیں اس کی ملاقات ظفر سے ہوتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔ اس دوران ظفر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت چلا جاتا ہے۔ اور فیروز کی اچانک موت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کو بے حد چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ صدمہ برداشت نہیں پاتی اور زندگی سے بے زار ہو جاتی ہے اور دنیا کنارہ کش ہو کر تنہا زندگی گزارنے لگتی ہے۔ ظفر ولایت سے واپس آ کر سمجھاتا ہے لیکن وہ شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتی اور بھائی کی روح کی تسکین کے لیے ڈاکٹری پڑھ کر غریب لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ مایوس و نامراد ظفر والدین کے اصرار پر شادی کر لیتا ہے۔ اس کے دو بچے ہیں وہ مسوری میں قیام پذیر ہے۔ یہاں ظفر کی ملاقات پھر فیروزہ سے ہوتی ہے۔ اور ظفر کو پتا چلتا ہے کہ فیروزہ ابھی تک اس کی محبت دل میں سجائے کنواری ہے۔ یہ جان کر ظفر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے اپنی بیوی بچے ہیں۔ پھر بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فیروزہ کے پاس پہنچ جاتا ہے لیکن چوں کہ فیروزہ پڑھی لکھی حساس دل کی مالک عورت ہے اسی لیے وہ دوسری عورت یعنی ظفر کی بیوی کا حق چھیننا نہیں چاہتی وہ ظفر سے کہتی ہے۔

''ظفر اب جو باتیں بے سود اور رنج زدہ ہیں ان کے کرنے سے کیا فائدہ اور اگر تم انھیں چھیڑو تو اپنی بیوی کے مجرم ہو۔ میرا مالک سوائے تمھارے کوئی نہ ہوگا۔ مگر تمھاری تمام محبت کی ایک اور دعویدار ہے، تمھارا فرض ہے کہ تم اس سے محبت کرو اس کو خوش رکھو مجھ سے ملنا یا مجھ سے محبت کرنا اخلاقی گناہ اور خدا کا گناہ ہے۔''(۲۱)

فیروزہ ایک عورت ہونے کے ناطے ایک عورت کے لیے شوہر کی محبت اور وفا کی اہمیت جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دل میں ظفر کی انتہائی محبت محسوس کرنے کے باوجود ظفر کے بڑھے ہوئے ہاتھ تھامنے سے انکار کر دیتی ہے۔

نذر سجاد کا یہ ناول عورت کی اس ازلی محبت کی بھی کہانی ہے۔ جو وہ بہن کے روپ میں بھائی کے لیے دل میں رکھتی ہے۔ فیروزہ ایک ایسی عورت جو بھائی کی وفات پر دل برداشتہ ہو کر تنہا ایک انجان جگہ پناہ لیتی ہے۔ اور دنیا سے لاتعلقی اختیار لیتی ہے۔ اور فیروزہ کا یہ شدت غم اسے ظفر کی محبت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اگر چہ فیروزہ کا یہ رویہ بعید از حقیقت معلوم ہوتا ہے، لیکن نذر سجاد نے بہن کی بھائی کے لیے محبت کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا ہے، نذر نے بہن کی آئیڈیل محبت کو پیش کیا ہے جو اپنی زندگی اور اپنی زندگی کی ہر خوشی بھائی کی محبت پر قربان کر دیتی ہے۔ اور ڈاکٹری پڑھ کر مرحوم بھائی کے ایصال ثواب کے لیے غریبوں کا مفت علاج معالجہ کرتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی فیروزہ کی محبت کا فسانہ غم ہے۔ ایک عورت کی بے لوث محبت کا خوب صورت مرقع ہے۔ بیک وقت دو رشتوں کی محبت کی اسیر فیروزہ کے کرب انگیز لمحوں کی داستان ہے۔ جہاں ایک رشتہ کی جدائی دوسرے سے جدا ہونے کا سبب بنتی ہے۔ یہ ایک عورت کی انتہائی محبت کا وہ رخ ہے جسے سمجھنے میں پدرسری سماج نے ہمیشہ دھوکا کھایا۔ ظفر اسی سماج کا نمائندہ کردار ہے، جو بدگمانیوں میں مبتلا ہو کر نیا رشتہ بنانے پر آمادہ تو ہو گیا، لیکن دوہری کیفیات کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اپنے تئیں بیوی کے حقوق و فرائض کا دعویٰ کرنے والا فیروزہ کو بھی دل میں جگہ دیے ہوئے ہے۔ مسوری میں ایک بار پھر سے فیروزہ سے ملاقات پرانی محبت کے تذکرے اور فیروزہ سے ملاقاتوں کی صورت میں نذر نے مردانہ معاشرت کی اس ذہنیت کی عکاسی کی ہے۔ جہاں شادی شدہ مرد کے لیے سب جائز اور روا ہے، مگر یہی سماج عورت پر کوئی بھی لیبل چسپاں کر دینے میں ذرا بھر بھی عار محسوس نہیں کرتا۔ فیروزہ پر بھی بلا جھجک و بلا تحقیق بے وفائی اور سنگ دلی کے مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ عورت جیسی رقیق القلب مخلوق کے لیے ایسے القاب بذات خود مرد کی سنگ دلی کا مظہر ہیں۔ بیگم ظفر جو اپنی سمجھ داری، مزاج شناسی اور محبتوں کی بدولت میاں کی آنکھ کا تارا بن گئی تھیں۔ بالآخر اسی کی بد دیانتی پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

> ''ظفر بیگم سے ضبط نہ سکا۔ مسہری پر پڑ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ ان کا پیارا شوہر آج فیروزہ سے رخصت ہونے گیا ہے۔''(۲۲)

انگلستان سے ڈاکٹری کر کے لوٹنے پر ایسی ہی سنگ دلی کا سامنا فیروزہ کو بھی ہے۔

> ''.....آخر کیا کروں.....اپنا سا دل سمجھتے ہو نا میرے جاتے ہی شادی رچالی۔''(۲۳)

مصنف نے فیروزہ کے کردار میں خالصتاً ایک مشرقی لڑکی کو پیش کیا ہے۔ جو وفا کا مجسمہ اور محبت کا پیکر ہے اور عہد محبت کا پیکر ہے، اور عہد محبت کو بڑے استقلال سے نبھائے جا رہی ہے۔ نذر سجاد نے اس کے ان نسائی جذبات کو زبان دی ہے جو مشرقی عورت کا خاصا ہیں:

> ''تمھارے خیال میں فیروزہ اس قدر بے وفا، عہد شکن اور وعدہ خلاف ہے کہ سالہا سال تک ایک شخص سے عہدہ پیمان قائم رکھ کر اور کسی سے شادی پر رضا مند ہو جاتی؟ اگر تمھارا یہ خیال ہے تو حقیقت میں بڑے ظالم اور سنگ دل ہو۔''(۲۴)

مشرقی عورت کا جذبہ ایثار تنہائیوں محرمیوں پر ہی منتج ہوتا آیا ہے۔ فیروزہ کو بھی محبتوں میں ایثار کے جذبات نے بالآخر زندگی کے لق ودق صحرا میں تنہا رہ جانے کر مجبور کر دیا۔ جسے وہ نصیب کا کھیل قرار دیتے ہوئے مردانہ وار حالات کے سامنے سینہ سپر ہے۔

فیروزہ نذر کی ایک تعلیم یافتہ، باحوصلہ اور خود اعتماد ہیروئن ہے جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے۔ ڈاکٹر بننے کے لیے انگلستان جاتی ہے، جاپان کیسیر کرتی ہے، بھائی کی جدائی میں رنجیدہ دل ہو کر ویرانے میں جا ٹھکانہ کرتی ہے۔ کم عمری میں اس طرح تنہا و بے یار و مددگار رہنا اس کی خود اعتمادی و بہادری پر دلالت کرتا ہے، لیکن ناول میں اس کی یہ خود اعتمادی جذباتیت کا شکار نظر آتی ہے۔ پورا ناول ہی جذبات کا بہتا ہوا دھار معلوم ہوتا ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کے احساسات کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ ناول کے آخر میں ظفر و فیروزہ جب ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ایک طلاطم خیز جذباتی منظر ہے:

> ''ظفر کچھ نہ بولا۔ فیروزہ نے خود اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ پھر آنکھوں سے لگائے اور وہ سوار ہو کر رخصت ہوا۔ دونوں کے سینے وفور رنج وغم سے پھٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے سامنے دونوں ضبط کئے رہے۔ مگر رکشہ کا بڑھنا تھا کہ خون دل ظفر کی آنکھوں میں امڈ آیا۔ ادھر فیروزہ گھر جا کر صوفے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔''**(۲۵)**

عورت کے جذبات کی ایسی عمدہ عکاسی نذر کی نسائی حسیّت کا بین ثبوت ہے۔

جان باز:

جان باز بھی اس سلسلے میں لکھا گیا ناول ہے جو قمر اور زبیدہ کی کہانی کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کا موضوع وطن پرستی ہے، زبیدہ ایک وطن پرست لڑکی ہے جس کی منگنی قمر سے ہو چکی ہے۔ قمر مغربیت کا پرستار نوجوان ہے۔ جب زبیدہ خود کو قمر کی مرضی کے مطابق نہیں ڈھال پاتی تو قمر اپنی ہم خیال لڑکی نجمہ سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن نجمہ کی حد سے بڑھی ہوئی آزاد خیالی کے باعث دونوں میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ زبیدہ جو قمر کی بے وفائی کے بعد خود کو قومی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ قمر کی حالت دیکھ کر اس کے قریب آجاتی ہے اور اس طرح دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

ناول کی کہانی حب الوطنی اور ہندوستانی سودیشی تحریک سے متعلق ہے زبیدہ ناول کا مرکزی کردار ہے جو قمر نامی شخص کی منسوبہ ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ، باشعور، خود اعتماد، اور سچی قوم پرست (لڑکی) کا کردار ہے جو تحریک عدم تعاون میں عملی حصہ لیتی ہے اور جس کا دل وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار ہے۔ مصنفہ نے زبیدہ کو مسلمان (لڑکی) کے لیے آئیڈیل بنا کر پیش کیا ہے لیکن مغربیت کا دل دادہ قمر، زبیدہ جیسی سرخی و غازے سے محروم دیش سدھاک لڑکی میں دل چسپی برقرار نہیں رکھ پاتا۔ اسے قابل رحم حالت میں چھوڑ کر اپنی ہم خیال اور فیشن پرست نجمہ نامی لڑکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور شادی کر لیتا ہے۔ نجمہ سے ملاقات کے بعد زبیدہ کی جان نثاری و وفاداری اب اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہاں مصنفہ نے مرد کی تلون مزاج فطرت پر چوٹ کرتے ہوئے اسے محبت سے عاری مخلوق قرار دیا۔ جو انسانیت کے بجائے مجسموں کا متلاشی رہتا ہے۔

''مردوں کو حقیقی محبت تو شاذ ہی ہوا کرتی ہے۔ یہ ظاہرا چمک دمک حسن کے شیدائی ہیں۔''(۲۶)

جس کا صلہ ہمیشہ اسے نجمہ جیسی عورت کے روپ میں ملتا ہے نجمہ ایک آزاد خیال اور بے باک لڑکی ہے جسے گھریلو زندگی سے کوئی دل چسپی نہیں ناچ، گانا، اور بال روم جانا جس کا مشغلہ ہے۔ نجمہ کی صورت میں نذر سجاد نے مغربی تہذیب کے دل دادہ طبقے کو سامنے لایا ہے۔ بلاشبہ نذر مسلمان عورت کو آزاد اور نڈر دیکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن عورت کی ایسی بے راہ راوی کے خلاف تھیں جس سے عورت کی نسوانیت وقار پر آنچ آئے۔ نذر اپنی صدی کی جدید خیالات کی مالک عورت تھیں لیکن بے جا آزادی کی بالکل قائل نہ تھیں۔ بقول ڈاکٹر شگفتہ حسین:

''.....ان کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا تلاش کر لیا جائے، مشرقی شرافت اور وقار کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو.....''(۲۷)

نذر فیشن و جدت کو پسند کرتی تھیں اپنے لڑکپن سے وہ فیشن لیڈر کے طور پر سامنے آئیں اپنی پھوپھی اکبری بیگم کے ساتھ مل کر کپڑوں کو ڈیزائن کرتیں جو فیشن ایبل طبقے میں بہت پسند کیے جاتے۔ اپنی جدت پسند طبیعت کے باوجود ہمیشہ اس امر کے خلاف رہیں جو مسلمانی طریقوں کو مسخ کر دیں۔ وہ مغربیت کے اٹھتے ہوئے طوفان کی مخالفت قمر کی زبانی کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''لعنت ہے مسلمانوں کی لڑکی ہو کر یہ ہوس یہ جرات۔''(۲۸)

وہ بیسویں صدی کی ترقی پسند لکھاری اور عورتوں کے حقوق کی بہت بڑی علم بردار تھیں۔ انھوں نے ہر موقع پر عورت کے شرعی حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ شادی جیسے اہم فیصلہ کے تعین میں عورت کی پسند و ناپسند کی اس حد تک قائل ہیں کہ ان کے ناولوں کے کردار اپنی بہن کا عقد اس شخص سے کرا دیتے ہیں جیسے بہن پسند کرتی ہے۔ جاں باز کا نور محمد بھی اپنی منہ بولی بہن زبیدہ کی رضا کو مدنظر رکھتے ہوئے قمر سے رشتہ طے کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بغیر عقد مرد عورت کی بے جا بے تکلفی کو نامناسب سمجھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ناول میں جگہ جگہ کرتی نظر آتی ہیں۔

نذر بے جا بے تکلفی اور آزادی کو عورت کی عصمت کے منافی قرار دیتی ہیں۔ نذر کا یہ ناول مغرب پرستی کے خراب نتائج پر مبنی ہے۔ اس لیے بہ حیثیت مجموعی عورتوں کے متعلق مصنفہ کے احساسات کا اظہار زیادہ نہیں۔ البتہ زبیدہ کا کردار نذر کے پسندیدہ کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

نجمہ:

ناول نجمہ ایک ایسی لڑکی کی سرگشت ہے جو مغربی رنگ میں رنگ کر اپنی زندگی اپنے ہی ہاتھوں برباد کر ڈالتی ہے۔ نجمہ سے جمیل کی ملاقات مسوری میں ہوتی ہے۔ جو ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں۔ لیکن جمیل کے گھرانے کی روایت پرستی اسی کھٹکتی ہے وہ جمیل سے کنارہ کش ہو کر کامران نامی شخص سے منسوب ہو جاتی ہے۔ جو ایک انتہائی روشن خیال اور عیاش پرست کردار ہے جلد ہی اس کا دل نجمہ سے اکتا جاتا ہے اور دونوں کی نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ اب نجمہ کو جمیل کی قدر معلوم ہوتی ہے مگر جمیل والدین کے اثرار پر شکیلہ سے شادی کر چکا ہوتا ہے۔ اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے کس مپرسی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

نذر کا یہ ناول بھی دوسرے ناولوں کے طرح رومانوی انداز میں اصلاح معاشرہ کا پرچارک ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی پرانی اقدار کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا اور دوسرا روشن خیالی کی رو میں بہہ کر اپنی بھرپور تہذیبی اقدار سے بھی متنفر ہو گیا تھا۔ نتیجتاً دونوں ہی رو بہ زوال تھے۔ نذر مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات کی انتخاب اور امتزاج چاہتی تھی۔ شکیلہ کی گفتگو مصنفہ کے انھی خیالات کی ترجمان ہے۔

''میری یہ رائے نہیں کہ لڑکیوں کو سخت پردے میں بٹھایا جائے یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ مگر اس امر کا خیال رکھنا لازمی ہے لڑکے لڑکیوں کو مذہبی تعلیم اور اچھی تربیت سب سے پہلے دی جائے۔''(۲۹)

ان کا یہ ناول مشرق و مغرب کے تہذیبی امتزاج کی خوب صورت مصوری ہے۔ جہاں عورت شمع محفل بھی نہیں اور مقید خانہ بھی نہیں۔ اگر چہ نذر کو مردوں کی برابری کا دعوی نہ تھا۔ لیکن مساویانہ حقوق کی وہ سب سے بڑی علم بردار تھیں۔ نذر نے مساویانہ حقوق کی جنگ تو تا عمر لڑی لیکن مسلمان خواتین کی بے جا آزادی کی ہمیشہ مخالف رہیں۔ نجمہ کے کردار کا بھیانک انجام مصنفہ کی اسی سوچ کا ترجمان ہے کہ آزادی بے راہ روی کا نام نہیں۔ نجمہ بے جا آزادی کا شکار ہو کر کامران جیسے غلط نوجوان سے منسوب ہو جاتی ہے جب کہ نجمہ کی کیفیت یہ ہے کہ:

''بس جناب میں بھر پائی، اب دولہا نہیں چاہیے کافی بدنام ہوئی ایک قدیم شریف گھرانے کی لڑکی کی ناچ گھروں میں گئی، غیر شخص کے ساتھ آزادانہ گھومتی پھرتی۔ مگر خدا جانتا ہے میں نے اس کو اپنی آئندہ زندگی کا مالک سمجھ کر ایسا کیا۔''(۳۰)

اس ناول کا ایک اور کردار نجمہ کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

''اگر لڑکیوں کو آزادی دی جائے تو اس کے یہی نتیجے رہیں گے۔ نجمہ نے اپنی پوری زندگی حد سے زیادہ آزادی کی ہوس میں اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی۔''(۳۱)

نذر کا یہ تبصرہ عورت کی بے جا آزادی پر قدغن لگاتا ہے قراۃ العین اپنی والدہ کے حوالے سے ایک واقع کا ذکر کرتی ہوئے لکھتی ہیں کہ موسم گرما میں مسوری کے سوائے ہوٹل میں چند مسلمان خواتین ہال روم میں رقصاں نظر آئیں تو نذر سجاد نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''عوام ایسے ہی مسلمان لڑکیوں کی تعلیم اور بے پردگی کے خلاف ہیں بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کو کالجوں اور اسکولوں سے اٹھا چکے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو ہال روم میں ناچتے دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ آخر تفریح کے اور بھی ہزار طریقے ہیں سیر و شکار، ٹینس، اسکٹینگ، گالف۔''(۳۲)

نذر عورت کی بے باکی و فیشن پرستی کو پسند نہ کرتی تھیں۔ تاہم معاشرتی قدروں اور آزادی کی حدود کے احساس کے ساتھ وہ عورت کے لیے اظہار رائے کی آزادی کی داعی تھی۔ لیکن روایت پرست سماج عورت تو درکنا مرد کو بھی یہ حق دینے کو تیار نہ تھا۔ شرم نے روایت کا حصہ بن کر زبانوں کو مقفل کر دیا تھا۔ بالخصوص شادی کے فیصلے میں فریقین کی رضا کو گناہ اور بے شرمی سے تعبیر کیا جاتا۔ نتیجتاً زندگیاں تلخ و بے مزہ ہو کر رہ جاتیں۔

''شکیلہ بھی سماج کی اس ستم ظریفی کا شکار ہوئی.....اور بڑی وجہ میری خاموشی کی یہ تھی کہ جب ایک خود مختار لڑکا دل پر جبر کر کے بزرگوں کی خوشی کے خیال سے خاموش ہو گیا ہے تو میری کیا ہستی ہے۔غرض کہ جو ہوتا تھا ہو کر رہا اور ہم دونوں کی زندگی بدمزہ اور دوبھر ہوئی۔''(۳۳)

یہی معاشرتی جبر مرد کو منافقت اور عورت سسک سسک کر جینے پر مجبور کر دیتا ہے۔جمیل کی شخصیت کا دوغلا پن نام نہاد مشرقی شرافت ہی کی دین ہے جس کے اظہار میں شادی تو شکیلہ سے رچا لیتا ہے لیکن اپنی محبتوں کا حق دار نجمہ ہی کو بنائے رکھتا ہے۔یہی رویہ شکیلہ بیگم جیسی صابر شاکر اور رحم دل عورت کو بھی اندیشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔شکیلہ شوہر کے اس رویے پر شاکی ہے جو اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں۔ذیل اقتباس عورت کے اسی کرب کی عکاسی ہے:

''بہت ہی محبت بھری ساعتوں میں جب کہ وہ مجھ پر بھی نثار ہوا کرتے تھے۔کسی خیال کے آتے ہی گم ہو کر آہ کر لیتے تھے۔ان کی اس کیفیت کا ان کی بیوی کے دل پر کیا اثر ہوتا ہوگا؟ ذرا اور بیویاں اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں۔''(۳۴)

شکیلہ و جمیل کی ناخوش گوار ازواجی زندگی کا نقشہ بیان کر کے مصنفہ شادی کا بندھن میں بندھنے کے لیے لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیتے ہوئے اپنے ایک کردار کی زبانی کہلواتی ہیں۔

''اگر شادی سے قبل لڑکا یا لڑکی کسی اور سے محبت کرتے ہوں اور شادی دوسری جگہ ہو جائے تو دونوں کی زندگی عذاب ہوتی ہے۔شریف میاں بیوی رو دھو کر بسر کر لیتے ہیں اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے خلاف بزرگوں کا حکم سنتیں اور اپنے چاہنے والوں کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔ان لڑکے اور لڑکیوں سے جو کچھ سرزد ہوتا رہتا ہے۔وہ آپ کو معلوم ہے معزز خاندان کی عزت برباد ہوتی ہے۔شادی ہمیشہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی سے ہونی چاہیے۔''(۳۵)

لیکن ساتھ ہی انھیں احساس ہے یہ کہنا آسان ہے لیکن ریت ورواج کے اسیر معاشرے میں اس پر عمل یقیناً مشکل ہے، کیوں کہ سماج کے بندھن اس کو پسند نہیں کرتے۔

''بھائی ہندستانی شادیاں اس طرح ہوتی ہیں پہلے شادی پھر محبت اور یہ کامیاب شادیاں ہیں اور جو لوگ پہلے محبت پھر شادی کرتے ہیں وہ ناکامیاب رہتے ہیں۔''(۳۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے نذر سماج کے بندھنوں کی سختی سے سخت نالاں ہیں۔نذر کے عہد کو معلومات کی صدی کہا گیا، جس نے ذہنوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی و تہذیبی اقدار کو گھن بھی لگا دیا۔بے راہ روی کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔مغربی تعلیم کو محض فیشن پرستی سمجھ لیا گیا۔خواتین میں بھی ایک ایسا طبقہ سامنے آنے لگا جس میں ہندوستانیت تھی نہ نسوانیت۔نذر عورت کے لیے یورپین ملمع کاری پسند نہیں کرتی تھیں۔مسلم معاشرت کے لیے ایسی آئیڈیل لڑکی کا تصور دیتی ہیں جو تعلیم یافتہ ہو، خود اعتماد ہو لیکن بے راہ روی کا شکار نہ ہو غرض وہ ایک مسلم لڑکی کو مشرق و مغرب کی بہترین خصوصیات سے مزین دیکھنا چاہتی ہیں۔

آہ مظلوماں:

آہ مظلوماں بنیادی طور پر دوسری شادی کے خطرناک نتائج پر مبنی ہے۔ناول میں دو کہانیاں چلتی ہیں۔ایک اعلیٰ طبقے کی اور دوسری متوسط طبقے کی۔ یہ قصہ ڈپٹی صاحب کا ہے۔ان کی شادی ایک معزز گھرانے میں ہوتی ہے۔ بی بی کا نام سلطنت آرا ہے جو ایک پڑھی لکھی باشعور عورت ہے۔ڈپٹی صاحب اور سلطنت آرا میں محبت موجود ہے لیکن ایک عورت زرین نامی ان کے درمیان آجاتی ہے۔میاں صاحب ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں بیگم کو حیلے بہانوں سے میکہ روانہ کر کے خود اس سے شادی کر لیتے ہیں۔سلطنت آرا کو شادی خبر ملتی ہے تو وہ بے چاری پھر بھی شوہر کی طرف آجاتی ہے۔ زرین کے طرح طرح کے الزامات کو برداشت کرتی ہے۔زرین ڈپٹی صاحب کے دل سے سلطنت آرا کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ صاحب ڈپٹی صاحب بیمار پڑ جاتے ہیں۔زرین ڈپٹی کی صحت سے مایوس ہو کر ملازمہ کے ساتھ مل کر زیور لے کر فرار ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اسے حدشہ ہے کہ اس اپنے زیور ڈپٹی صاحب کے علاج کے لیے فروخت کرنے پڑ جائیں گے۔سلطنت آرا کو جب ان تمام معاملات کی خبر ہوتی ہے تو وہ تمام خطائیں بھول کر یہ کہتے ہوئے کہ آپ نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔مردوں کا کام ہی یہ ہے۔ڈپٹی صاحب کی طرف لوٹ آتی ہیں۔سلطنت اس سماج کی پیداوار تھی جس میں مرد کی ہر خطا اور منافقانہ رویے کو مرد کا شیوہ کہ کر معاف کرنے کا سبق عورت کو کم سنی ہی سے پڑھایا جاتا تھا اور اسے عورت کے شریفانہ طور واطوار سے منسوب کیا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ سلطنت تعلیم وشعور سے بہرہ مند ہونے کے باوجود ڈپٹی صاحب کے سنگ دلانہ فعل پر یہ کہ کر خاموش اختیار کر لیتی ہے۔

> ''میں بھی یہ سب باتیں جانتی ہوں اور تنہا ہی ان کو پورا مزہ دکھا سکتی ہوں مگر مجھے یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ خلاف دستور شرفا ہندستان میں کوئی جھگڑا کراوں جو مصیبت ہوں گی برداشت کروں گی۔ مگر منھ سے اف تک نہیں کروں گی۔''(۳۷)

ناول کا دوسرا حصہ متوسط گھرانے کا ہے۔ جہاں عظمت اس کی والدہ اور اس کی بیوی زبیدہ رہتے ہیں۔زبیدہ سلیقہ منداور خاموش طبع عورت ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو پدرسری سماج کی مشرقیت کی تعریف کا مکمل عکاس ہے۔ناول میں سلطنت آرا اپنی جدید تعلیم اور زبیدہ اپنی جہالت کے ساتھ سماجی اقدار اور مشرقی روایات کی پاس دار نظر آتی ہیں۔اگر سلطنت آرا یہ پاس داری تعلیم نسواں کو منفعیت کے لیبل سے بچانے کے لیے تھی تو زبیدہ اس تہذیب کی دین تھی جس میں شوہر مجازی خدا اور ساس حقیقی خدا کا روپ تھی جس کی خوش نودی حاصل کرنے کی تاکید سن بلوغ سے ہی بچیوں کو دی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے جب آبادی بیگم اپنے بیٹے کی دوسری شادی کرواکر زبیدہ کو پرانے گھر بھیج دیتی ہے۔تو زبیدہ ہر طرح کا ستم خاموشی سے سہہ گزرتی ہے کہ یہ شرفاء کی عورتوں کا دستور تھا۔ظلم کے بدلے تابعداری اور وفاداری اس صدی کی عورت کی تہذیب بن چکی تھی۔زبیدہ اسی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے۔ جو بگڑے ہوئے حالات میں نہ صرف اس گھر میں واپس آتی ہے بل کہ شوہر اور ساس کی تیمارداری بھی کرتی ہے اور سلائی کڑھائی کے کام سے گھر کا خرچ بھی چلاتی ہے۔ یہ ناول دراصل عورتوں پر کیے جانے والے مظالم اور دوسری شادی کے خطرناک نتائج کو سامنے لاتا ہے۔جس کا شکار اعلیٰ اور متوسط دونوں گھرانوں کی خواتین ہیں۔جن کے لیے شوہر کی دوسری شادی کو بے بسی سے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

نذر کی نسائی حسیت عورت کی مظلومیت پر نوحہ کناں ہے۔ یہاں وہ آبادی بیگم اور ڈپٹی صاحب کی دوسری بیوی کی صورت میں عورتوں کے اس طبقے کی نشان دہی کرتی ہیں جو عورت کو پیستی ہیں اور خود اپنے طبقے کو برباد کرتی ہیں۔اس

قصے میں زبیدہ اور سلطنت آراء ایک ہی طرح کے حالات سے دوچار ہیں۔ دونوں حالات کا مقابلہ بہادری سے کرتی ہیں لیکن چوں کہ سلطنت آراء تعلیم یافتہ عورت ہے اپنے حقوق کا ادراک رکھتی ہے وہ شوہر سے دبے الفاظ میں دوسری شادی کی وجہ بھی پوچھتی ہے۔

''کوئی ضرورت نظر نہ آئے آپ کے عقد ثانی کی کوئی شکایت نہیں سنی۔۔۔ میں یہ بھی نہ کہ سکوں گی کہ اولاد کے لیے شادی ہے۔ کیوں کہ لڑکا موجود ہے۔''(۳۸)

زبیدہ اور سلطنت آراء کا کردار مظلوم ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی ہے۔ دونوں اپنے شوہر کی شادی پر رونے دھونے کی بجائے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں جب کہ انھیں اپنے شوہر کے اس فعل کا دکھ بھی ہے۔ سلطنت آراء اعلیٰ طبقے سے ہے اور زبیدہ متوسط سے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دوسری شادی کا خطرناک مرض دونوں طبقات میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس ناول کا سب سے مضبوط کردار زبیدہ کا ہے۔ وہ اتنی حوصلہ مند ہے کہ شوہر کی دوسری شادی کے بعد سوتن کی خدمت کرتی ہے۔ بچوں کو سنبھالتی ہے لیکن اف تک نہیں کرتی۔ شوہر کی لاپروائی اور بے حسی کے نتیجے میں مایوسی کا شکار ہونے کی بجائے سلائی کر کے بچوں کے اخراجات پورے کرتی ہے اور جب شوہر کی حالت خراب ہوتی ہے تو واپس آ کر گھر سنبھالتی ہے۔ سوت کے بچے کا دھیان رکھتی ہے۔ نذر عورت کو مجبور ہوتے ہوئے بھی اس قدر مظبوط دیکھنا چاہتی ہیں کہ وہ خود بے سہارا ہو کر بھی کسی کا سہارا ہے جس کے لیے اس صبر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے مصنفہ کے الفاظ میں جا بجا احتجاج کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ قوم کے ریفارمر کو پکارنے کے ساتھ نذر عورتوں کو احتجاج کے لیے اکساتی ہیں لیکن ان کا رویہ پھر بھی وہی ہے۔ جو ایک شوہر پرست بیوی کا ہو سکتا ہے۔ بھائی رشید الملک سلطنت آراء کو اکساتے ہیں۔

''ڈپٹی صاحب نکاح ثانی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور بتائیں اجازت مذہبی کی آڑ میں جس قدر چاہے ظلم کر لیا۔ آخر ان کو ضرورت ہی کیا تھی دوسری شادی کی۔۔۔۔ آپ ہرگز اس وقت خاموشی اختیار نہ کریں۔ آپ کی صدہا ہندستانی مظلوم بہنیں اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اگر آپ نے بھی انھیں کی طرح روجھینک کر زندگی دی تو کچھ فائدہ نہ ہوگا آپ کی تعلیم کا۔''(۳۹)

رشید الملک کا کردار ایک پڑھے لکھے باشعور اور روشن خیال ہندوستانی مرد کا ہے جو تانیثی سوچ اور روپ کا حامل ہے۔ رشید الملک اپنے ہم جنسوں کے روایتی اور جاہلانہ رویوں سے نالاں و عاجز نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا بہنوئی (ڈپٹی صاحب) اس کی بہن کو دھوکا دے کر دوسری شادی رچا لیتا ہے تو وہ ایک عام ہندوستانی کی طرح عورت کو ہر ظلم برداشت کر کے کر کے سسرال سے مر کر ڈولی اٹھنے کی نصیحت نہیں کرتا بل کہ وہ ایک پڑھی لکھی عورت کا ایسے رویے پر چُپ سادھ لینے کو پورے طبقہ نسواں کے خلاف ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔

دکھ بھری کہانی:

دکھ بھری کھانی کا موضوع بھی دوسری شادی اور جہیز کا لالچ ہے۔ قصے کا مرکزی کردار نجیبہ کے حالات کے سامنے بے دست و پا ہے جو ایک غریب گھر میں پیدا ہوئی یتیمی ولاوارثی نے ماموں ممانی کے در پر لا پھینکا۔ احسان علی سے شادی نے نئی مصیبتوں کے در اس پر وا کر دیئے شوہر بیوی کا قدر دان ہو تو ساس کے روپ میں موجود عورت کی ازلی دشمنی آڑے آئی۔ اولاد نرینہ کے بہانے احسان کی دوسری شادی طے کر دی گئی۔ حمیدہ ایک تو نئی بیوی تھی۔ دوسرے جہیز بھی نجیبہ سے زیادہ لائی تھی۔ پدرسری ذہنیت نے نئی بیوی کے آنے پر پرانی بیوی کو مالکن سے نوکرانی کی حیثیت پر لایا اور بالآخر

گھر سے نکال باہر کھنڈر مکان میں ڈال دیا۔ قصے کے آخر میں مصنفہ جذباتی ہو کر قوم کے ریفارمر کو پکارتی ہیں۔

''اے قوم کے ریفارمر سب سے پہلے اس بے بس مظلوم فرقے کی خبر لینی ضروری ہے آخر یہ بھی تو اس قوم کا ایک حصہ ہے۔ جن کے ہاتھوں قوم پرورش پاتی ہے۔''(۴۰)

ناول کا اختتام خزنیہ ہے۔ نجیبہ ویرانی و مایوسی کے عالم میں کھنڈر نما عمارت میں دم توڑ دیتی ہے۔ نذر نے اپنے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی مرد کی خود غرض فطرت اور ساس کے روپ میں عورت کی اس رقابت کو موضوع بنایا جو تعلیم و تربیت کے فقدان کے باعث خواتین میں دائمی قدر کے طور پر پائی جاتی تھی۔

مذہب اور عشق:

مذہب اور عشق اسلامی ناول ہے لیکن یہ نذر کے دیگر ناولوں سے الگ ہے۔ اس کا موضوع عورت کی اصلاح ہی ہے مگر یہ اصلاح اپنے طور پر کرانے کے بجائے نذر نے اسلام کے نقطہ نظر سے کروائی ہے۔ ناول کی ہیروئن کا نام سوشیلا ہے جو ایک تعلیم یافتہ آزاد گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب بیرون ملک سے تعلیم حاصل کر کے لوٹتی ہے تو اس کی ملاقات ایک مسلمان نوجوان شبیر سے ہوتی ہے۔ اسلام میں عورت کے مرتبے اور مقام کو لے کر دونوں کی بات ہوتی۔ شبیر سوشیلا کی اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ وہ سوشیلا کے پوچھے گئے تمام سوالوں کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیتا ہے۔ سوشیلا بے حد متاثر ہوتی ہے اور اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وہ شبیر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ ایک رومانوی کہانی ہے لیکن نذر نے سوشیلا کے سوالات کے ذریعے خواتین کو پیش آنے والے کئی مسائل پر توجہ دلائی ہے۔ سوشیلا شبیر سے کہتی ہے:

''دنیا کے کسی مذہب نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ہر مذہب عورتوں کو مردوں کی کنیز قرار دیتا ہے جن لوگوں میں جتنی مذہبیت ہے ان میں عورت اس قدر ذلیل ہے۔''(۴۱)

سوشیلا سمجھتی ہے کہ ہر مذہب عورت کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ عورت کے ساتھ رکھا جانے والا غیر مساویانہ سلوک ہی ہر طرف دیکھتی ہے جب کہ شبیر اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسلام میں عورت کو مساویانہ درجہ حاصل ہے۔ سوشیلا عورتوں کی شادی کے متعلق بحث کرتی ہے کہ عورت کو سماج میں مرضی کی شادی کی اجازت نہیں لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کہیں بھی کر دی جاتی ہے۔ شبیر اس معاملے میں بھی اسلام کی روشنی میں اسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔

''اسلام میں ہر مرد عورت کو سن بلوغ تک پہنچنے کے بعد اس کا کامل اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جسے چاہے رفیق زندگی بنائیں۔''(۴۲)

اسلام کے اصولوں کے مطابق اتنی باتیں سن کر سوشیلا بے حد متاثر ہوتی ہے۔ سوشیلا ہر بات کو حقائق پر رکھنے کی عادی ہے کیوں کہ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے فیصلے پر اس کی بھاوج چندرانی اسے سختی سے تنبیہ کرتی ہے۔ تو سوشیلا جواب میں کہتی ہے:

''اس زمانہ میں کوئی کسی پر سختی کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ میں تو ہندوستانی ادب و لحاظ کی وجہ سے سب کچھ سہتی ہوں۔ اگر نہ سہوں تو کسی کو مجھ پر بے جا تشدد کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا آپ لوگ پرانے ہندوؤں کی روایات کو تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک آزاد خیال لڑکی یہ سختی برداشت نہیں کر

سکے گی۔''(۴۳)

سوشیلا اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہے وہ سماج کے کھوکھلے اصولوں اور نام نہاد عزت پر اپنی زندگی قربان نہیں کرنا چاہتی اس لیے مخالف کے باوجود بھی وہ اسلام قبول کرتی ہے۔شادی سے قبل شبیر سوشیلا سے پوچھتا ہے۔کہ کہیں وہ اس کی محبت کی خاطر تو اسلام قبول نہیں کر رہی۔اس پر سوشیلا واضح انداز میں کہتی ہے۔کہ عورتوں سے متعلق میرے ذہن میں کئی سوال تھے،ان کا واضح جواب مجھے اسلام میں نظر آیا۔میں نے اس لیے اسلام قبول کر لیا۔اس سے بات واضح ہوتی ہے۔کہ سوشیلا کی اسلام کی طرف رغبت کی وجہ اسلام میں عورت کی مساویانہ حیثیت ہے۔نذر کوئی باضابطہ مذہبی مبلغ نہیں تھی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسرے مذاہب کی نسبت اسلام میں عورت کی حیثیت بہتر ہے تو انھوں نے اس بات کو تفصیلی طور پر اپنے ناول میں پیش کیا۔یہ بھی خواتین کی اصلاح کی ایک کوشش ہے۔

نذر کی سنائی حسیت عورت کی جس حیثیت کو دیکھنا چاہتی تھی وہ انھیں اسلام میں نظر آئی۔وہ اس لیے اس بات کو کھلے طور پر نمایاں کرتی ہیں۔نذر پردے کے خلاف تھی اور عورتوں کی آزادی میں اسے ایک رکاوٹ خیال کرتی تھی۔وہ اپنے ناول میں بھی اسی احتجاج کو بلند کرتی نظر آئی جب سوشیلا پردے کے بارے میں گل نار سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے:

''بہن پردے میں ایک دو خرابیاں ہو تو بیان کی جائیں،اس میں برائی ہی برائی ہے۔''(۴۴)

نذر کے نزدیک پردے میں کوئی اچھائی نہیں بل کہ پردہ عورت کی لیے قید ہے۔اس لیے وہ اپنے کرداروں کے ذریعے پردے کو خراب گردانتی ہیں۔غرض کہ نذر کے خیالات یہ آشکا کرتے ہیں یہ وہ سماج میں عورت کو کس طرح دیکھنا چاہتی تھی۔

ثریا:

ناول ثریا کا موضوع بغیر مرضی کی شادی کے خراب نتائج ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردار ثریا ہے جو کہ ایک حسین لڑکی ہے جس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی ہے۔نواب کیواں قدر اس کے چاہنے والوں میں سے ایک ہیں۔جن سے اس کی ملاقات اپنی سہیلی موہنی کے بھائی سندر لال کی پارٹی میں ہوتی ہے۔دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن کیواں قدر کے گھر والے اس شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتے۔کیوں کہ وہ کیواں قدر کی نسبت بچپن سے ہی سلطنت آراء سے طے کر چکے تھے۔کیواں قدر گھر والوں کی مرضی کے خلاف،موہنی اور سندر لال کی مدد سے خاموشی کے ساتھ ثریا سے شادی کر لیتے ہیں۔کیواں کے والدین جب ان کی سلطنت آراء سے شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کیواں نے ثریا سے شادی رچا لی ہے لیکن وہ اس رشتے کو قبول کرنے کے بجائے کیواں کو عاق کرنے کی دھمکی دیتے ہیں جس پر کیواں سلطنت آراء سے شادی کر لیتا ہے۔ثریا اس وقت کیواں کے بچے کی ماں بننے والی ہوتی ہے۔دادی کے لیے یہ بات باعث ننگ و عار تھی کہ شادی ہوتے کسی نے نہ دیکھی اور نواسہ سب دیکھیں۔صبح ہوتے ہی گھر چھوڑ کر بھتیجے کے پاس چلی گئیں۔ثریا نے بھی اس بربادی قسمت پر لکھنؤ چھوڑ دیا اور انتہائی مصیبت زدہ زندگی گزارنے لگی۔کیواں قدر شادی کے سال بعد سول سروس کے لیے انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ہندوستان واپسی پر ایک روز ان کی ملاقات ثریا سے ہو جاتی ہے۔اب کیواں معاشی طور پر فارغ البال ہے اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتا ہے۔لہٰذا والدین کی پسند سے لائی ہوئی بیوی کو والدین کے پاس چھوڑ کر آئندہ زندگی ثریا اور اپنے

بیٹے آسمان قدر کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

نذر کے اس ناول کا موضوع بھی بغیر مرضی کی شادی اور اس سے جنم لینے والی تلخیاں ہیں۔ جن کا شکار ہر دو سطح پر عورت ہی ہوتی ہے۔ چاہے وہ سماجی اقدار کی پاس داری میں سلطنت کے روپ میں بیوی بنے یا پسند کی صورت میں ثریا کی شکل میں سامنے آئے۔ دو سطح پر جذباتی و ذہنی کرب کا شکار عورت ہی ہوتی ہے۔ ناول عورت کے ازدواجی زندگی کے اس کرب کو بیان کرتا ہے جو شوہر کے روپ میں مرد کے بے التفاتی کے رویے سے سہتی ہے۔ ناول میں ثریا ان تکلیف دہ لمحات سے اس وقت گزرتی ہے جب کیواں قدر مجبوریوں کے سامنے بے بس ہو کر سلطنت آراء سے منسوب ہو کر ثریا کو ایک بچے کے ساتھ بے سہارا چھوڑ دیتا ہے۔ سلطنت آراء کو اس اذیت کا اس وقت سامنا ہے جب وہ اپنی تمام محبت کیواں پر نچھاور کر کے تین بچوں کے ساتھ کیواں کی طرف سے جھٹلا دی جاتی ہے۔ مرد کے اس دوغلے پن پر نذر کی نسائیت نوحہ کناں ہے؛ ''یہی ہے مردوں کی انسانیت و محبت آفرین ہے۔''(۴۵)

نذر نے اس ناول میں ایک اہم معاشرتی المیے کو پیش کیا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں والدین کی اکثریت بچوں کی شادی کے معاملے میں اپنی پسند و ناپسند کو اہمیت دیتی ہے اور بچوں کی رائے کو اس معاملے میں بے شرمی سے تعبیر کرتی ہے۔ زبردستی کے منڈھ دیئے جانے والے فیصلوں کے نتیجے میں کئی زندگیاں تلخ ہو جاتی ہیں۔ بچے باشعور ہونے کے باوجود اپنی من چاہی زندگی نہیں گزارتے۔ کیواں قدر سلطنت آراء کو چھوڑنے کی وجہ اپنے والد کو لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> '' حضور جانتے ہیں کہ مجھے سلطنت آراء بیگم (بیوی) سے ذرا محبت و موانست نہیں۔ اس صورت میں ان سے کیسے نباہ کر سکتا ہوں جب کہ میری دل و جان کی مالک مجھے مل گئی ہے .....آپ میری۔۔۔۔ اس بے ادبی کو معاف فرمائیں گے اور آئندہ اپنے پوتوں کی شادیوں کے وقت احتیاط سے کام لیں گے اور ان کی شادیاں ان کی مرضی کے موافق کریں گے۔''(۴۶)

نذر کامیاب ازدواجی زندگی گزرنے کے لیے لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کو ضروری گردانتی ہیں۔ ناول میں ثریا جب کیواں خاموشی سے نکاح کرنے پر کہتی ہے کہ خدا ہمارا گناہ معاف نہیں کرے گا تو نذر کیواں قدر کی زبان سے یہ بات پیش کرتی ہیں:

> ''ہم نے خدا کا ذرا بھی گناہ نہیں کیا اگر کچھ ملزم ہیں تو سوسائٹی کے جاہلانہ رسم و رواج کے۔ ہمیں شرعاً و قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند و محبت سے اپنے عمر بھر کے رفیق کا انتخاب کریں۔ والدین یا کوئی دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔''(۴۷)

نذر کے دور میں متحدہ ہندوستانی معاشرت کئی پُر فریب رسم و رواج میں جکڑی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں کئی معصوم عورتوں کی زندگیاں جہنم بن رہی تھیں۔ نذر ایک اصلاحی پرچارک کے طور پر اُبھری اور اپنے ناولوں کے ذریعے سماج سے ان فرسودہ ریت و رواج کو ختم کر کے ان کی اصلاح کرنی چاہیے۔

شہید جفا:

اس ناول کا موضوع دوسری شادی اور اس سے پیدا ہونے والی ناگوار صورتِ حال ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کوشلیا، سرلا، مسٹر چند اور مسٹر روشن لال ہیں۔ کوشلیا اور سرلا کی دوستی انگلینڈ میں بورڈنگ سے شروع ہوئی ہے۔ انگلینڈ

سے واپسی پر جہاز میں ان کی ملاقات مسٹر چندر سے ہوئی ہے۔کوشلیا، مسٹر چندر میں دل چسپی لینے لگتی ہے۔مسٹر چندر بھی اسے پسند کرنے لگتے ہیں اور کوشلیا سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر والدہ اور دادی کے اس رشتہ کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ناراضگی میں جائیداد چھوڑ کر ایک سیٹھ کی دوکان کی منیجری اختیار کر لیتے ہیں لیکن کوشلیا ان سے بے وفائی کر کے اپنی دوست سرلا کے شوہر روشن لال سے شادی رچا لیتی ہے۔سرلا ان دنوں نینی تال میں ٹھہری ہوئی تھی۔کوشلیا کی دھوکا دہی سے اپنے شوہر کے ساتھ شادی کی خبر پڑھتے ہی رنج والم کی کیفیت میں زندگی کا گلا اپنے ہی ہاتھوں دباڈالتی ہے۔

نذر کا یہ ناول مرد کی دوسری شادی جیسے قبیح فعل پر جنم لینے والے عورت کے اس درد و کرب کا عکاس ہے جس نتیجے میں وہ زندگی ہار بیٹھتی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں کثرت ازدواج نے رواج کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی زد میں پڑھا لکھا، ان پڑھ، ادنی، اعلی ہر طبقے کا مرد تھا۔ جو کوئی بھی جواز یت پیش کر کے شادی کر لیتا تھا اور بعض دفعہ جواز دینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔مسٹر روشن لال بھی شہید جفا کا ایک ایسا ہی کردار ہے۔ جو اولاد نرینہ کے بہانے بیوی کی سہیلی کوشلیا کو رفیقِ حیات بنالیتا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ سرلا کا بھری کائنات میں اس کے سوا کوئی بھی عزیز اور سرپرست باقی نہیں رہا۔نذر عورت ہونے کے ناطے عورت کی اس تڑپ کو اچھے سے محسوس کرتی ہیں جو مرد اسے دوسری شادی کی صورت میں دان کرتا ہے۔اس لیے وہ ایسے مرد کو ظالم اور ایسی رسموں کو وحشیانہ قرار دینے میں ذرا بھی نہیں چونکتی؛ ''ظالم مرد اور ہندوستانی رسمیں تعلیم پا کر بھی یہ لوگ ایسے وحشیانہ فعل کرنے سے نہیں رکتے۔''(۴۸)

وہ جانتی ہیں کہ مردوں کا یہ فعل اس سماج کے لیے قابل نفریں نہیں بل کہ اولاد نرینہ کی آڑ میں کی گئی شادیاں مردانہ سماج میں ضرورت اور وقت کا تقاضا کہلاتی ہیں۔اس لیے وہ سرلا کہ بہ زبانی کہتی ہیں:

> ''.....لوگ اُن کی شادی کو ضرورت وقت کے مطابق بجا کہیں گے کہ ۵ سال سے اولاد نہیں ہوئی دوسری کرنی لازمی تھی۔''(۴۹)

نذر سجاد کی نسوانی سوچ ناول میں جا بجا اس روایت کا تدارک کرتی نظر آتی ہے اور اس حصول کے لیے وہ قصہ کے کرداروں کے خارجی افعال پر زور دیتی ہیں۔

نذر سجاد کے یہ ناول نو آبادیاتی ہندستان کی معاشرتی وسماجی زندگی کے بہترین عکاس ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف مسلم معاشرت کی عورت کی مجبوری، بے بسی ولاچاری کو پیش کیا بل کہ انھیں ایک الگ راہ بھی دکھائی۔ نتیجتاً عورتیں اپنی روایتی زندگی سے ہٹ کر نئی چیزوں کو اپنانے کے لیے غور وفکر کرنے لگی اور جدید تبدیلیوں میں خود کو مدغم کرنے کی ریس میں شرکت کرنے لگی۔نذر کی تحریروں نے خواتین میں ایک نئی سوچ اور ایک نئے شعور کا احساس پیدا کیا۔ ذرا اپنی صدی کی روشنی خیال اور جدت پسند خاتون تھی۔مگر ان کی تانیثی فکر مغربی تانیثیت سے قدرے مختلف تھی۔مغرب سے جنم لینے والی فیمینزم کی تحریک برصغیر میں داخل ہو کر ہندوستانی مسلم سماج کے معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی صورت میں اردو ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ہارون انیس،فیمینزم اور پاکستانی عورت،مشمولہ: فیمینزم اور ہم، (کراچی:وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء)،مرتبہ:فاطمہ حسن،ص۱۲

۲۔ ناصر عباس نیر،متن، سیاق اور تناظر،(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۲ء)،ص۹۱

۳۔ فیمینزم اور پاکستانی عورت،مشمولہ:فیمنزم اور ہم،ص۱۲

۴۔ ثاقب رزمی۔آزادی نسواں کا نیا سویرا،(کراچی: مکتبہ دانیال،۱۹۸۲)،ص۹۱

۵۔ عقیلہ جاوید،اردو ناول میں تانیثیت،(ملتان:بہاءالدین زکریا یونیورسٹی،۲۰۰۵ء)،ص۵۵

۶۔ صغرا مہدی،تحریک نسواں کے علم بردار:خواجہ الطاف حسین حالی،مشمولہ:فیمینزم اور ہم،ص۲۱

۷۔ عظمیٰ فرمان،اردو کی ادبی تحقیق وتنقید میں خواتین کا حصہ ،ص۳۴

۸۔ قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے،(لاہور: مکتبہ اردو ادب،س ن)،جلد اول،ص۲۰۹

۹۔ نذر سجاد، اختر النسا بیگم،(لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۲۵ء)،مرتبہ:قرۃ العین حیدر،ص۵۷

۱۰۔ نذر سجاد حیدر،ایک تجویز،مشمولہ:عصمت ، (دہلی:۱۹۲۸ء)،جلد۴،ص۳۰۲

۱۱۔ اختر النسا بیگم،ص۵۷

۱۲۔ ایضاً،ص۱۰۴

۱۳۔ ایضاً،ص۴۴

۱۴۔ ایضاً،ص۹۰

۱۵۔ نذر سجاد،رسم منگنی،مشمولہ: عصمت،(دہلی:۱۹۲۷ء)،جلد۲۸،ص۳۲۹

۱۶۔ اختر النساء بیگم ،ص۱۷۲،۱۷۳

۱۷۔ ایضاً،ص۲۴۱

۱۸۔ ایضاً،ص۲۳۶

۱۹۔ ایضاً،ص۱۷۹

۲۰۔ ایضاً،ص۱۴۶

۲۱۔ نذر سجاد حیدر،حرماں نصیب ،(لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۸ء)،ص۸۶

۲۲۔ ایضاً،ص۷۳

۲۳۔ ایضاً،ص۷۰

۲۴۔ ایضاً،ص۷۶

۲۵۔ ایضاً،ص۸۹

۲۶۔ نذر سجاد حیدر، جان باز،ص۳

۲۷۔ شگفتہ حسین، بنت نذر باقر اور آزادی نسواں، مشمولہ: دریافت، (اسلام آباد: نمل، ۲۰۰۳ء)،ص۵۰۰

۲۸۔ جان باز،ص۱۵

۲۹۔ نذر سجاد حیدر، نجمہ، (دہلی: عصمت بکڈپو، ۱۹۴۲ء)،ص۱۷۴

۳۰۔ ایضاً،ص۲۱

۳۱۔ ایضاً،ص۱۷۵

۳۲۔ کار جہاں دراز ہے،ص۲۷۲

۳۳۔ نجمہ،ص۱۷۳

۳۴۔ ایضاً،ص۱۶۹

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً،ص۱۰۷،۱۰۸

۳۷۔ نذر سجاد حیدر، آہ مظلوماں، (لاہور: دارالاشاعت پنجاب ۱۹۴۰ء)،ص۲۴

۳۸۔ ایضاً،ص۶۰

۳۹۔ ایضاً،ص۲۴

۴۰۔ نذر سجاد حیدر، دکھ بھری کہانی، (لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۵ء)،ص۲۱،۲۲

۴۱۔ نذر سجاد حیدر، مذہب اور عشق، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۲۰۰۴ء)، مرتبہ: قرۃ العین حیدر،ص۸۵

۴۲۔ ایضاً،ص۱۱۴

۴۳۔ ایضاً،ص۹۲

۴۴۔ ایضاً،ص۱۰۶

۴۵۔ نذر سجاد حیدر، ثریا، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء)،ص۷۸

۴۶۔ ایضاً،ص۱۰۵

۴۷۔ ایضاً،ص۵۱

۴۸۔ نذر سجاد حیدر، شہید جفا، مشمولہ: نیرنگِ خیال، (راولپنڈی، ۱۹۳۲ء)،ص۳۲

۴۹۔ ایضاً،ص۲۸